رضوان اللہ

قوّامیت رجال

تمہید

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شوہر اور بیوی کی حیثیت میں مرد و زن کا آپس کا تعلق کس نوعیت کا ہے، یہ محض باہمی رفاقت کا ایک معاہدہ ہے یا پھر جبلی تقاضوں کو پورا کرنے کا کوئی انتظام ہے؟ اس تعلق میں فریقین کی حیثیت کیا ہوتی ہے، کیا بائع اور مشتری کی طرح یہ بالکل برابر کی سطح پر ہوتے ہیں یا پھر ان میں سے ایک حاکم اور دوسرا اس کی مفتوح و مغلوب رعایا ہوتا ہے؟ اس تعلق میں بندھ جانے کے بعد دونوں کے درمیان میں تقسیم کار کس طرح ہوتی ہے، کیا ایک کی قسمت میں صرف حقوق اور دوسرے کے نصیب میں محض ذمہ داریاں آتی ہیں یا پھر ترازو کی تول ان دونوں میں تقسیم کار ہوتی ہے؟ اس تعلق میں دراڑ پڑتی ہو تو کیا کرنا چاہیے، اسے بے دھڑک توڑ تاڑ کر دل پھینک بھنورے کی طرح فوراً کسی اور پھول کی تلاش میں نکل جانا چاہیے یا پھر اسے پاؤں کی بیڑی قرار دے کر زندگی کو ایک زنداں بنا لینا چاہیے؟ یہ سب اور اسی طرح کے کچھ دوسرے سوالات ہیں جو سماجی اور مذہبی علوم میں ہمیشہ سے بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ سماجیات کے ماہرین ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں، مذہبی علما اور وہ بھی مسلمان علما کی طرف سے اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ بھی اپنے اندر اتنا تنوع، اور صحیح تر الفاظ میں، اس قدر اختلاف رکھتا ہے کہ ایک طالب علم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ حقائق کا پتا چلائے، اور معلوم کرے کہ اس معاملے میں اسلام کی اپنی تعلیمات، درحقیقت ہیں کیا؟ زیر نظر ہمارا یہ مقالہ، اصل میں اسی سلسلے کی ایک کڑی اور خالص دلیل کی بنیاد پر اس نوع کے

سوالات حل کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔

مذکورہ سوالات کے علماے اسلام کی طرف سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بہت سے جوابات دیے گئے ہیں، مگر ان سب میں قرآن مجید سے استدلال کا طریق اور اس سے تفہیم مدعا کا طرز، بالعموم تین ہی طرح کا رہا ہے:

۱۔ مردوزن کے بارے میں معاشرے کی موجودہ روایات اور اس کے عرف کو اس طرز میں پہلے اصل قرار دے لیا گیا اور پھر اسی کی روشنی میں قرآنی ہدایات کو پڑھنے اور ان سے احکام کو اخذ کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں، البتہ اس بات کا لحاظ رہا کہ جو عالم مشرق یا مغرب، جس معاشرے سے تعلق رکھتا تھا، اسے صرف اُسی کی روایات کا پاس اور قرآن میں انھی کی تلاش سے مطلب رہا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا رہا کہ جب دوسروں سے مرعوبیت کا ذہن بنا یا پھر مروّجہ قدروں کے ردّعمل میں کچھ نئی قدریں پیدا ہو گئیں تو انھی کو حق اور سچ جان کر ان کے لیے مذہبی بنیادیں فراہم کرنے کا بیڑا بھی اٹھا لیا گیا۔

۲۔ ایک طرز یہ رہا کہ مذکورہ بالا طریق جن دو انتہاؤں کو جنم دیتا تھا، بعض حضرات کے ہاں ان میں موافقت پیدا کرنے اور ان کے مقابلے میں ایک معتدل راے پیش کرنے کا جذبہ پروان چڑھا۔ انھوں نے خارج میں ایک ''معتدل'' اور نہایت ''متوازن'' راے قائم کی، اسے بیان کرنا دینی و اخلاقی فرض جانا اور آخر کار اسی کے رنگ میں سب قرآنی ہدایات کو رنگ کر رکھ دیا۔

۳۔ اس موضوع پر کلام کرنے کا یہ انداز بھی ہر دور میں متداول رہا کہ ہر چیز سے بالاتر ہو کر قرآن کو پڑھا گیا۔ اس کا مفہوم طے کرنے میں کسی ماحول کو دخل ہوا اور نہ کسی مقصد کو۔ بس یہ ہوا کہ قرآن کی اپنی بات کو سمجھ لیا گیا اور پھر اسے ہی خدا کی ہدایت کی حیثیت سے بیان کر دیا گیا۔

صاف واضح ہے کہ اول الذکر دو طریق تو ایسے ہیں کہ ان میں کچھ اہداف پہلے سے مقرر کر لیے گئے اور پھر انھی کو قرآن کا نام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ خارج کو قرآن میں داخل کر دینے کا عمل ہے، اور اسی وجہ سے غیر علمی اور حق سے ہٹا ہوا ایک عمل ہے۔ ان کے مقابلے میں جو تیسرا طریق ہے، تو اس میں قرآن مجید کو ویسا ہی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے۔ اگرچہ اس میں بھی ایک مسئلہ ضرور درپیش رہا ہے کہ نقص علم جب آڑے آیا یا کج فہمی اور تدبر کی کمی نے جو کبھی آفت ڈھا دی تو نتیجہ اس کا بھی یہی ہوا کہ سارے کا سارا قرآن خارجی نظریات کی بازگشت بن کر رہ گیا، تاہم کسی شے کو پڑھنے کا علمی طرز چونکہ صرف یہی ہے، اس لیے ہمیں بھی اس تحریر میں اسے ہی اختیار کرنا ہے۔ مردوزن کے بارے میں کون کیا کہتا ہے، اس بات سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن ہی کو دیکھنا اور اسی سے اس کی ہدایت کو پانے کی کوشش کرنا ہے۔

قرآن مجید کی دو آیات ایسی ہیں جو ہمارے خیال میں اس مقصد کے لیے حد درجہ کفایت کرتی ہیں۔ انھیں اگر ٹھیک طریقے سے پڑھ لیا جائے تو جس طرح مذکورہ بالا تمام سوالوں کا تسلی بخش جواب ہو جاتا ہے، اسی طرح ان معاملات میں اسلامی نقطۂ نظر اصلاً ہے کیا، وہ بھی واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اُن آرا پر بھی ایک طرح کا تبصرہ ہو جاتا ہے جن میں خارج کے نظریات قرآن میں ڈھونڈنے کا عمل ہوتا، ملّی روایات کو عین اسلامی قرار دیا جاتا یا پھر قرآن ہی کے نام سے غیر قرآنی نظریات کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ آیندہ کے صفحات میں ہم ان آیات کا مطالعہ کریں گے اور اس ضمن میں پیدا ہونے والے عمومی شبہات کا ذکر اور قرآن ہی کی روشنی میں ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ عظیم الشان دو آیات یہ ہیں:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا، وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا. (النساء ۴: ۳۴-۳۵)

”مرد عورتوں کے سربراہ بنائے گئے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔ جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو اور ان کے بستروں پر انھیں تنہا چھوڑ دو اور انھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کا رویہ اختیار کر لیں تو ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ اور اگر تم میاں اور بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ محسوس کرو تو ایک حکم مرد کے لوگوں میں سے اور ایک عورت کے لوگوں میں سے مقرر کر دو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک، اللہ علیم و خبیر ہے۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قوّامیت رجال

'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ' (مرد عورتوں کے قوّام ہیں)۔ یہ جملہ خدا کی شریعت کا بیان ہے۔ اس میں مرد سے مراد شوہر اور عورتوں سے مراد اصل میں انھی کی عورتیں، یعنی بیویاں ہیں۔ اور قوّام سے مراد ان شوہروں کا منتظم اور سربراہ ہونا ہے۔ یہ آیت کا سادہ مفہوم ہے جو بنا کسی رکاوٹ کے سمجھ میں آتا اور بادی النظر میں قرآن کے ہر اُس طالب علم پر واضح ہو جاتا ہے جو اِس کی زبان سے آشنائی، اس کے اسالیب کی پرکھ اور اس کے اندازِ بیان سے کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔ البتہ بعض حضرات ایسے بھی ہیں جن کے لیے اس جملے سے مذکورہ مفہوم کو اخذ کر لینا ممکن نہیں رہا۔ اس کی وجہ دراصل ان کے کچھ علمی شبہات ہیں۔ ہم ذیل میں انھی شبہات اور ان کی اصل حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

۱۔ آیت میں چونکہ 'اَلرِّجَال' اور 'اَلنِّسَآء' کے الفاظ آئے ہیں کہ جن کا اصل معنی شوہر اور بیوی نہیں، بلکہ مرد اور عورت ہے، اس لیے بعض حضرات کو یہ خیال ہوا کہ اسلام میں ہر مرد کو ہر عورت پر قوّام بنایا گیا ہے۔ یعنی جس طرح شوہر بیوی کا قوام ہے، اسی طرح باپ بیٹی کا، بھائی بہن کا اور بیٹا ماں کا قوام ہے، حتیٰ کہ مرد بحیثیت مجموعی اپنے معاشرے کی ہر عورت کا قوام ہے۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ یہ حضرات زبان کے ایک عمومی اسلوب کا لحاظ نہیں کر پائے کہ جس سے اہل علم عام طور پر واقف ہی ہیں۔ وہ یہ کہ بعض اوقات گفتگو میں الفاظ تو عام بولے جاتے ہیں، مگر ان کا موقع استعمال ان میں ایک طرح کی تخصیص پیدا کر دیتا ہے۔ عام لفظ کا اس طرح تخصیص میں چلے جانے کا یہ اسلوب، کم و بیش ہر زبان میں ایک مسلّم قاعدے کی حیثیت رکھتا اور اہل زبان کی بول چال اور ان کی تحریر و تقریر میں، بالعموم شائع و ذائع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''مرد نان و نفقہ کا بار اٹھا کر بچوں سے بے پروا ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے اصل قربانی تو عورت دیتی ہے''، تو بنا کسی اُلجھن اور تکلف میں پڑے سبھی یہ جان لیتے ہیں کہ اس جملے میں عورت اور مرد سے ان دونوں کی پوری جنس نہیں، بلکہ صرف ماں اور صرف باپ مراد ہیں۔ یہی اسلوب ہے جو مذکورہ آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں 'اَلرِّجَال' اور 'اَلنِّسَآء' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں، مگر ان کے بارے میں آنے والی وضاحتیں اور مختلف نوع کی ہدایات آخری درجے میں واضح کر دیتی ہیں کہ ان سے

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

مراد سب مرد وعورت نہیں، بلکہ صرف میاں اور بیوی ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس طرح کے اسالیب کو برتنے میں محض زبان کی خوب صورتی کا لحاظ نہیں ہوتا، بلکہ کوئی نہ کوئی معنویت بھی اس کا باعث ہوا کرتی ہے کہ جس کا ابلاغ متکلم کے پیش نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کیا مدعا ہے کہ جس کے لیے قرآن نے عربی زبان میں زن وشو کے لیے مستعمل خاص لفظوں کے بجاے ان عام لفظوں کو استعمال کیا ہے؟ یہ مدعا، اس آیت کے سیاق پر نظر ہو تو بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس آیت کی تمہید آیت ۳۲ پر اٹھائی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں آیت ۳۲ کی اصل ہے کہ جس پر یہ متفرع ہوئی ہیں۔ اُس میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ.

”اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اُس کی تمنا نہ کرو، (اِس لیے کہ) مردوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ انھیں مل جائے گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا ہے، اُس کا حصہ انھیں بھی لازماً مل جائے گا۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

واضح سی بات ہے کہ یہاں جس فضیلت کی تمنا کرنے سے روکا گیا ہے، وہ بلا اختلاف مرد وعورت کی باہمی فضیلت ہے۔ مزید یہ کہ وہ اپنی حقیقت میں کسبی نہیں، بلکہ خِلقی ہے۔ پہلی بات کی دلیل آیت میں مرد اور عورت کے الفاظ کا موجود ہونا ہے، اور دوسری بات کی دلیل خلقی کی تمنا چھوڑ کر کسبی کے حصول کی ترغیب دینا ہے۔ گویا یہ بات تمہید ہی میں واضح ہوگئی کہ مرد وزن کو ایک دوسرے پر کچھ نہ کچھ خلقی فضیلت ضرور حاصل ہے۔ اس کے بعد آیت ۳۴ میں جب زن وشو کے بارے میں ہدایات دینے کا موقع آیا کہ جس میں ایک فریق کو اس کی خلقی فضیلت ہی کی بنیاد پر قوامیت دی جانی ہے تو ظاہر ہے یہاں میاں اور بیوی کے نہیں، مرد اور عورت کے الفاظ ہی موزوں ہو سکتے تھے، وہ اس لیے کہ یہ تخصیص میں جا کر میاں اور بیوی کے رشتے کو تو بیان کرتے ہی، ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ عموم میں رہتے ہوئے یہ خاندان کے دائرے میں مرد کی خلقی فضیلت کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتے۔

۲۔ کچھ لوگ اس بات کو تو ٹھیک سمجھے ہیں کہ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ' میں مرد وعورت سے مراد میاں بیوی ہی ہیں، مگر اس میں بیان کردہ قوامیت کے صحیح مفہوم کو سمجھ لینے سے وہ قاصر رہ گئے ہیں۔ وہ عربی لغت کے نہایت معتبر حوالوں سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ 'قوّام علی' کا مطلب صرف اور صرف 'مانھا' ہے، یعنی

شوہر نے بیوی کے لیے روزی روٹی کا انتظام کیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ شوہر بیویوں کے سربراہ ہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ محض ان کی مالی ضرورتوں کے ذمہ دار ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ 'قام' جب عورت کے حوالے سے اور 'علی' کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کا مطلب 'مانھا'، یعنی روزی مہیا کرنا اور عورت کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ہو جانا ہے، تاہم یہ بات بھی واضح رہے کہ شوہر کی یہ ذمہ داری اس طرح کی نہیں ہے کہ جس سے مقصود صرف نان ونفقہ دے دینا ہو، بلکہ یہ بیوی کے تمام معاملات کا منتظم ہوتے ہوئے پھر اس کی مالی ضرورتوں کا کفیل ہو جانا ہے[1]۔ یہی وجہ ہے کہ اہل لغت میں سے جنھوں نے اختصار کے بجائے تفصیل کا انداز اپنایا ہے، انھوں نے اس ترکیب کا مفہوم بیان کرتے ہوئے 'مانھا' کہہ دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ 'وقام بشانھا' کا بھی ذکر کیا ہے[2] کہ جس کا معنی بہر حال عورت کے جمیع امور کا ذمہ دار ہو جانا ہے۔

البتہ، اس مقام پر یہ بات سامنے رہے کہ 'قوّام علی' کا مذکورہ مفہوم، صرف لغت کے حوالے سے ہے، وگرنہ جہاں تک زیر بحث آیت کا تعلق ہے تو یہاں اس کا مطلب اب 'مالی کفیل' کا نہیں، صرف اور صرف سربراہ ہونے کا ہے۔ اس کی وجہ بھی زبان کا ایک معروف قاعدہ ہے۔ اس میں ہوتا یوں ہے کہ بعض اوقات کوئی لفظ اپنے معنی کے کسی خاص پہلو سے خالی رہ جاتا یا دوسرے لفظوں میں اس سے مجرد ہو جاتا ہے۔ لفظ کا اس طرح مجرد ہو جانا، اصطلاح میں تجرید عن المعنی کہلاتا ہے۔ کلام عرب میں یہ تجرید عام طور پر متداول ہے اور قرآن مجید میں بھی اس کی کئی مثالیں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، وارث اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے مرجانے کے بعد اس کے مال کا مالک ہوتا اور اس میں تصرف کرنے کا حق پاتا ہو، مگر 'اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ، الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ[3]' کی آیت میں ظاہر ہے، اس کا یہ معنی لے لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ فردوس وہ شے نہیں جو کسی سابق متصرف کے اچھی طرح سے اس کو برت لینے اور پھر مرجانے کے بعد مومن کو دی جائے گی، بلکہ یہ تو خدا کا عطا کردہ وہ مقام ہوگی کہ جس میں دیا جانے والا ہر عطیہ مہر بند اور جہاں کی ہر بخشش اچھوتی ہوگی۔ غرض یہ کہ یہاں 'وارث' کا لفظ جس طرح کسی کے مرنے کے بعد اس کے مال کا مالک ہونے سے مجرد ہو کر صرف مالک ہو جانے کے لیے استعمال ہوا ہے، بالکل اسی طرح 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ' کی آیت میں 'قوام علی' مالی کفیل کے معنی سے مجرد ہو

---

[1] ذمہ داری کے اس فرق کو اس مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص مسجد کے اخراجات کے لیے باقاعدہ کچھ رقم دیتا ہے اور بس، مگر دوسرا وہ ہے جو اصل میں مسجد کا متولی اور ناظم ہے، چنانچہ اس حیثیت سے اس پر خرچ بھی لازماً کرتا ہے۔

[2] جیسے علامہ فیروز آبادی نے ''القاموس المحیط'' میں اور علامہ زبیدی نے ''تاج العروس'' میں۔

[3] المومنون ۲۳: ۱۰-۱۱۔

کر صرف اور صرف منتظم اور سر براہ ہو جانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'قوام علی' کے دو پہلوؤں میں سے کس کی تجرید ہوئی اور کون سا علیٰ حالہ رہا، اس کی دلیل خود آیت کے سیاق میں موجود ہے۔ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ' کے بعد جب یہ جملہ آ گیا کہ وہ مرد اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں تو یہ بات حتمی ہو گئی کہ اس میں سے مالی کفالت کے معنی کی تجرید ہوئی ہے، کیونکہ یہ تجرید نہ مانیں تو کلام میں ایسی نامعقولیت پیدا ہو گی جو خدائی کلام تو کجا، کسی انسانی کلام کے بھی شایان شان نہیں ہے۔ یعنی مرد عورتوں کے سر براہ ہیں، اس لیے کہ وہ مال خرچ کرتے ہیں، اس سادہ اور پُر حکمت بات کی جگہ کچھ اس قسم کی پیچیدہ اور مہمل بات سامنے آئے گی: ''مردوں کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے کہ وہ بیویوں پر خرچ کریں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان پر خرچ کرتے ہیں۔'' گویا یہ آیت ایک ذمہ داری اور اس کی وجہ کا بیان نہ ہوئی، کسی سزا کا بیان ہو گئی جو مرد بے چارے کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے ہی پر سنا دی گئی ہے۔

اسی طرح 'قَوّٰمُوْنَ عَلَی' میں کون سا معنی باقی رہ گیا ہے، اس سوال کا جواب بھی اُس وقت واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے، جب اس جملے کے بعد یہ باتیں کہی جاتی ہیں:

ا۔ نیک عورتیں شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔

ب۔ اگر یہ تمھاری اطاعت کریں تو پھر ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ ظاہر ہے، اس طرح کی باتیں شوہر کو سر براہ مان لینے کے بعد ہی کہہ دینی ممکن ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com

۳۔ بعض حضرات یہ تو مانتے ہیں کہ 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ' کی آیت میں میاں بیوی کا ذکر ہوا اور اس میں قوّام ہونے سے مراد بھی سر براہ ہونا ہی ہے، مگر ان کے نزدیک اس آیت کا خبریہ پیرایہ ایک اور ہی بات بیان کر رہا ہے۔ ان کے خیال میں قرآن کا مخاطب معاشرہ چونکہ اپنی فطرت میں ایک پدری (patriarchal) معاشرہ تھا کہ جس میں مرد کو بالفعل عورت پر حاکمیت حاصل تھی، اس لیے اس خبریہ پیرائے میں کسی اخلاقی اور شرعی حکم کا بیان نہیں ہوا، بلکہ اس کے ذریعے سے معاشرے میں رائج روایات کی صرف خبر دی گئی ہے۔

یہ راے دراصل اس مغالطے پر مبنی ہے کہ قرآن میں زبان کا یہ خبریہ اسلوب، صرف اور صرف معاشرے کے حالات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات پر دلالت کیا کرتا ہے، حالاں کہ اہل علم اس بات سے عام طور پر واقف ہیں کہ قرآن جس طرح مختلف انواع کے اسالیب استعمال کرتا ہے، اسی طرح بعض اوقات ایک ہی اسلوب کے مختلف استعمالات بھی کیا کرتا ہے۔ اس میں یہ معمول کی بات ہے کہ مذکورہ پیرائے میں سابقہ و موجودہ اقوام کے

حالات بیان کیے جائیں گے اور اسی میں خدا کی طرف سے مقرر کی گئی شریعت بھی بیان کر دی جائے گی۔ مثال کے طور پر 'اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ[۴]' کا جملہ ہے۔ یہ ہے تو خبریہ اسلوب میں، مگر سب جانتے ہیں کہ یہ گردوپیش میں ہونے والے کسی واقعہ کا نہیں، بلکہ خدا کی شریعت کا بیان ہے۔ یہی معاملہ زیر بحث آیت کا بھی ہے۔ یہ بھی پدری قسم کے کسی معاشرے، اس کے ظلم اور اس پر مبنی کسی استحصال کا نہیں، بلکہ خدا کی شریعت ہی کا بیان ہے؛ اور اس بات کی دلیل خود اس آیت کا سیاق اور سباق ہے۔

۴۔ اسی قسم کے بعض دوسرے لوگ ہیں جو اس آیت سے متعلق مذکورہ بالا تمام حقائق کو مان کر بھی ایک نئے مسئلے کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں شوہر کو بیوی کا شرعی طور پر سربراہ بنایا گیا ہے، یہ بات صحیح ہے، مگر اس کی بنیاد پر یہ کہہ دینا کہ شوہر ہمیشہ کے لیے بیویوں کے سربراہ بنا دیے گئے ہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں چونکہ سماجی حالات کی رعایت سے ہدایات دی جاتی ہیں جو اِن حالات پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہوتی بھی وقتی اور عارضی ہیں، اس لیے زیر بحث آیت میں بھی عرب کے پدری معاشرے کا لحاظ کرتے ہوئے جو کچھ ہدایات دی گئی ہیں، وہ اپنی نوعیت میں عارضی ہی ہیں۔ چنانچہ ان کی بنیاد پر نہ تو کوئی قدر ہمیشہ کے لیے مرد و زن پر مسلط کی جا سکتی اور نہ عمل کا کوئی میدان مستقل طور پر ان کے لیے مقرر کیا جا سکتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں، ہر وہ معاشرہ جس کا مزاج پدری نہیں رہ گیا، اس آیت کی ہدایات اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اب اس سے متعلق نہیں رہی ہیں۔

ان لوگوں کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ قرآن اپنے احکام دیتے ہوئے گردوپیش کے حالات کی رعایت کرتا ہے۔ بلکہ اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنا اس پر لازم بھی ہے۔ وہ اس لیے کہ کوئی بھی حکم اُس وقت ہی معقول اور قابل عمل قرار پاتا ہے، جب وہ اپنے مخاطبین سے براہ راست تعلق رکھتا اور انھی کے ماحول سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہو۔ ان لوگوں کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ قرآن وقتی مصالح کی رعایت سے جو حکم دیتا ہے، وہ حالات پر منحصر ہونے کی وجہ سے ہوتے بھی وقتی ہیں، اس لیے کچھ وقت گزرنے اور حالات میں واضح طور پر تغیر آ جانے کے بعد وہ کالعدم ہو جاتے یا اپنی ظاہری ساخت، کم سے کم ضرور کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر ان دونوں صحیح باتوں کو ملا کر یہ کہہ دینا کہ قرآن میں صرف اور صرف وقتی احکام پائے جاتے ہیں، یہ بات یک سر غلط ہے۔ ایک عام درجے کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ کتاب صرف وقتی ہدایات کا مجموعہ نہیں۔ اس قسم کی ہدایات اگر اس میں موجود ہیں تو ابدی نوعیت کی ہدایات بھی اس میں موجود ہیں، بلکہ اول الذکر تو اس میں محض مستثنیات کی حیثیت رکھتی اور انتہائی قلیل تعداد میں پائی

۴؎ البقرہ ۲: ۲۲۹۔ ''یہ طلاق (ایک رشتۂ نکاح میں) دو مرتبہ (دی جا سکتی) ہے۔''

جاتی ہیں اور جو مستقل بالذات وجود رکھتی اور اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں، وہ دراصل ثانی الذکر ہدایات ہی ہیں۔ اس میں ایمان کے متعلق ساری تعلیمات ابدی ہیں، اخلاقیات کے سارے مباحث ابدی ہیں اور شریعت بھی اپنی جزئیات سمیت، صدفی صد ابدی ہے۔ چنانچہ اس میں موجود ایک قسم کی ہدایات کو تسلیم کرنا اور پھر اسی کی بنیاد پر دوسری قسم، جو نہ صرف اس میں موجود ہو، بلکہ کثیر تعداد میں موجود ہو، اس کی نفی کر دینا ایک غیر علمی طرز اور اپنے حدود سے صریح طور پر تجاوز کر جانا ہے۔

یہاں عارضی اور ابدی ہدایات کے بارے میں چند باتیں مزید پیش نظر رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ قرآن میں عارضی مصالح کے تحت دی گئی ساری ہدایات بھی ایک ہی معنی میں عارضی نہیں ہیں۔ ان میں سے اگرچہ وہ بھی ہیں جو نزول قرآن کے وقت اور اس کے احوال سے اس طرح خاص ہیں کہ اب ان پر عمل کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی، تاہم انھی میں سے اکثر وہ بھی ہیں جو اب بھی قابل عمل ہیں یا آیندہ پھر سے قابل عمل ہو سکتی ہیں۔ پہلی کی مثال یہ آیت ہے: 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ'[5]۔ اس میں بیان ہونے والی تعلیم واقعتاً عارضی نوعیت کی ہے، اس لیے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کی مجلس کے شرکا کے ساتھ خاص ایک معاملہ تھا اور آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس مجلس کے بپا ہونے کا کوئی امکان ہے نہ اس کے متعلق تعلیمات پر عمل کرنے کا اب کوئی موقع ہے۔ دوسری قسم کی مثال یہ آیت ہے: 'وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ اِنَّهٗ کَانَ مَنْصُوْرًا'[6]۔ اس میں بیان کردہ تعلیم بھی عارضی ہے، اس لیے کہ یہ تعلیم اس معاشرے کو دی گئی تھی کہ جس میں قاتل کو اجتماعی طور پر سزا دینے کا ابھی کوئی انتظام نہ ہو سکا تھا، تاہم یہ اس طرح کی عارضی نہیں ہے کہ اس پر اب کبھی بھی عمل نہ ہو سکتا ہو، بلکہ آج بھی اگر کوئی معاشرہ اسی حالت میں ہو یا پھر پلٹ کر اسی حالت میں چلا جائے تو اس آیت کی تعلیم پھر سے اس کے لیے قابل عمل ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ کہ قرآن جیسی کتاب جو الہامی ہونے کی دعوے دار ہے، اس میں ابدی ہدایات کا وجود، انتہائی

---

[5] البقرہ ۲: ۱۰۴۔ ''ایمان والو، (تم بارگاہ رسالت میں بیٹھو تو) 'رَاعِنَا' نہ کہا کرو، 'اُنْظُرْنَا' کہا کرو اور (جو کچھ کہا جائے، اسے) توجہ سے سنو، اور (اس بات کو یاد رکھو کہ) اِن کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

[6] بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳۔ ''اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو، اس کے ولی کو ہم نے اختیار دے دیا ہے۔ چنانچہ وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے، اس لیے کہ اس کی مدد کی گئی ہے۔''

معقول بھی ہے اور از حد ضروری بھی۔ وہ اس لیے کہ ہماری فطرت اپنے اندر اخلاقی داعیات رکھتی اور عقل انھی کی بنیاد پر وقتی مصالح کے تناظر میں ایک قانون کو وضع کر لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے، لیکن ہماری یہ صلاحیت ہرگز نہیں کہ ہم حالات موجودہ کے تناظر سے اٹھ کر حقائق کا ادراک اور ان پر مبنی کسی مستقل حکم کا استخراج کر سکیں۔ یہاں ہم مجبور محض ہیں کہ خدا ہماری رہنمائی کرے اور ہمیں ابدی احکام عطا کرے۔ اب جو ابدی شریعت کے منکر ہیں، انھیں ان دو سوالوں کا جواب ضرور دینا چاہیے: اول یہ کہ ان کے دعوے کے مطابق اگر قرآن میں صرف عارضی احکام پائے جاتے ہیں تو بتایا جائے کہ عقل وفطرت کی موجودگی میں ان کی اصلاً ضرورت ہی کیا ہے؟ دوم یہ کہ اگر اس میں ابدی احکام نہیں پائے جاتے تو اسے خدائی کتاب کی حیثیت سے دوسروں کے سامنے پیش کرنا، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

ہمارے خیال میں آیت 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ' کے تحت عارضی اور ابدی کی اصولی بحث چھیڑ دینے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ان دونوں کے ثبوت کو اصول میں مانتے ہوئے ہمیں ہر آیت کو علیحدہ سے دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے مضمون اور سیاق کے لحاظ سے کس نوعیت کی حامل ہے۔ کیا اس پر عمل کرنا آج کے دور میں یا پھر ہمیشہ کے لیے ناممکن ہو چکا یا پھر اس پر آج بھی عمل ہو سکتا اور قیامت تک ہو سکتا ہے؟ اس نظر سے مذکورہ آیت کو دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں دی جانے والی ہدایت کے وقتی اور عارضی ہونے کی کوئی دلیل اس آیت میں تو کیا، پورے قرآن میں کہیں موجود نہیں ہے۔ البتہ، اس ہدایت کی نوعیت اور اس کا سیاق اس کے ابدی ہونے پر نہایت واضح دلیل ضرور رکھتا ہے۔ اول تو میاں اور بیوی کا ادارہ کہ جو ہمیشہ سے چلا آتا اور اسے ہمیشہ کے لیے قائم بھی رہنا ہے، اس کے بارے میں دی گئی تعلیمات محض عارضی ہوں، یہ بات ہی غیر معقول ہے۔ پھر اس حکم کے جو وجوہ بیان کیے گئے ہیں، وہ اپنی حقیقت میں اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ انھیں کسی عارضی حکم کی بنیاد سمجھا جائے، بلکہ ان میں سے ایک اپنی ذات میں فطری ہونے کی وجہ سے اور دوسرا فطری ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون معاشرت کا ایک اہم حصہ ہونے کی وجہ سے نہایت واضح طور پر ابدی نوعیت رکھتا ہے۔ تفصیل ان کی آیندہ صفحات میں آئے گی۔

۵۔ کچھ لوگ یہ بات تو مان لیتے ہیں کہ شوہر قرآن مجید کے مطابق بیویوں کے قوام ہی ہیں، مگر اس پر ایک سوال اٹھا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے میاں اور بیوی، دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھ کر معاملہ کیوں نہیں کیا، کیوں ان میں سے ایک کو دوسرے پر حاکم بنا دیا گیا؟ اور ایسا کیوں نہیں ہوا کہ حاکم اور محکوم کے بجائے انھیں دو دوست قرار دیا جاتا کہ یہ زندگی سے صحیح طور پر حظ اٹھاتے، دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے اور اس طرح معاشرے کو مفید اور تعمیری اکائی فراہم کرنے کا ایک موثر ذریعہ بن جاتے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس اعتراض نما سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن خود یہ چاہتا ہے کہ میاں بیوی کے مابین دوستوں اور ہم جولیوں کا سا ماحول ہو، پیار اور محبت کا رشتہ پایا جاتا ہو، یہ اچھی معاشرت قائم کریں اور زندگی سے خوب خوب حظ اٹھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے لیے بالعموم 'زَوْج' کا لفظ استعمال کرتا[7]، ان کی فطری مودّت کا ذکر کرتا[8]، انھیں ایک دوسرے کا لباس قرار دیتا[9] اور ان کی آزادیوں اور بے تکلفیوں کو بیان کرنے کے لیے کھیتی تک کا استعارہ استعمال کرتا ہے[10]۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ انسانی رشتوں میں مراتب کا جو واضح فرق ہے، اس کا بھی لحاظ رہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ماں باپ اور ان کی اولاد ممتا اور شفقت کے باہمی ناتوں کے باوجود، آپس میں مراتب کا فرق رکھتے ہیں اور اتنا فرق رکھتے ہیں کہ اولاد کے لیے اِن کی برابری کرنا تو بہت دور کی بات، بے زاری سے 'اونہوں' کہہ دینا بھی روا نہیں ہے۔ یہی معاملہ استاد اور طالب علم کے باہمی رتبے کا ہے۔ اور فرق مراتب کا یہی وہ اصول ہے جو زن وشو کے رشتے پر بھی مکمل طور پر لاگو ہوتا ہے۔ آج کا سماج چاہے انھیں برابر کی سطح پر دیکھتا اور رفقا سے اوپر کوئی حیثیت دینے کو تیار نہ ہوتا ہو، مگر قرآن کی تعلیم بڑی واضح ہے کہ ان میں سے ایک بہر حال قوّام ہے۔ اور یہ قوامیت ہی ہے جو ان کے درمیان میں مراتب کی تقسیم پیدا کر دیتی اور لازم قرار دیتی ہے کہ اس کا ہر دم، حتیٰ کہ محبتوں کے ہر موسم میں بھی لحاظ رکھا جائے، یعنی ان میں اُلفت ہو، محبت ہو، عشق اور مستی ہو، پیار کی وہ جولانیاں ہوں کہ ماضی کی ہر داستان محبت صرف وہم سمجھی جائے، کسی شاعر کا خیال سمجھی جائے، مگر اس سب کے باوجود، ایک گونا رتبے اور درجے کا فرق ان میں پھر موجود ہو۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جہاں تک سوال کے اس حصے کا تعلق ہے کہ میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے پر حاکم بنایا ہی کیوں گیا ہے؟ تو اس کے جواب میں دو باتیں سامنے رہنی چاہییں: پہلی یہ کہ حاکم کا لفظ قرآن نے استعمال نہیں کیا۔ یہ 'قوام علی' میں موجود استعلا کو بیان کرنے کے لیے مفسرین یا پھر مترجمین کا اختیار کردہ لفظ ہے۔ لہٰذا آج کی دنیا میں اس سے پیدا ہونے والے توحش اور تنفر کی ذمہ داری کسی مفسر اور کسی مترجم پر آئے تو آئے، قرآن پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ قرآن نے جو 'قوام علی' کی ترکیب بیان کی ہے، اس کا معنی اہل لغت کی تصریحات کے مطابق حاکم کا نہیں،

---

[7] النساء۴:۲۰۔

[8] الروم۳۰:۲۱۔

[9] البقرہ۲:۱۸۷۔

[10] البقرہ۲:۲۲۳۔

بلکہ منتظم یا سربراہ کا بنتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ دوسری بات جو اس سلسلے میں سامنے رہنی چاہیے، وہ اس رشتۂ نکاح کی حقیقت ہے۔ یہ بات تو ہم سب مانتے ہیں کہ نکاح باہمی رفاقت کے پیمان کا دوسرا نام ہے، لیکن یہ بات بھی ہمیں مان لینی چاہیے کہ یہ مرد وزن کی محض رفاقت ہی نہیں ہے کہ یہ تو اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی اور یہ حسن وخوبی حاصل ہو سکتی ہے۔ نکاح اصل میں رفاقت سے آگے بڑھ کر خاندان کا ادارہ وجود میں لانے کا ایک اعلان بھی ہے[11]۔ سو نکاح کی یہی حقیقت ہے جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ جس طرح ریاست کے ادارے یا کسی کاروباری ادارے کا ہم سربراہ بناتے ہیں، اسی طرح خاندان کے اس ادارے کا بھی کوئی سربراہ بنائیں۔ نیز وہ سربراہ ہو بھی صرف ایک۔ اس لیے کہ ادارے کی بقا اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ اس پر دو دو سربراہ لا دیے جائیں اور وہ اختیارات کے معاملے میں ہمیشہ منازعت کا شکار رہیں۔ یہ ساری باتیں اس قدر واضح ہیں کہ قرآن عورت کے بجاے مرد کو سربراہ بنانے کی دلیل تو دیتا ہے، مگر ان میں سے کسی ایک کو کیا سربراہ ہونا بھی چاہیے یا ان میں سے صرف ایک ہی کو ہونا چاہیے، وہ سرے سے ان باتوں کی کوئی دلیل نہیں دیتا کہ یہ سب اس ادارے کا ناگزیر تقاضا ہے۔ غرض یہ کہ مرد وزن کو ایک جیسی حیثیت دینے کے بجاے ان میں سے ایک کو اگر سربراہ بنانا پڑا ہے تو اس کی واحد وجہ خاندان کا یہ ادارہ ہے، جو اگر نہ ہوتا تو ان دونوں کو نکاح کے بعد بالکل برابری کا درجہ دے دیا جاتا۔

۶۔ شوہر کا بیوی پر حاکم ہونا نہیں، بلکہ محض اس کا سربراہ ہو جانا، کچھ نازک طبیعتوں پر یہ بھی گراں گزرا ہے اور وہ کسی بھی صورت میں اسے مان کر دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کے اس انکار کی، اگر غور کیا جائے تو دو بنیادی وجوہات ہیں: پہلی یہ کہ مرد کی سربراہی کو یہ حضرات ایک وجۂ ترجیح خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سربراہی مرد کو آسمان پر بٹھا دینے اور عورت کو زمین تلے گرا دینے کا ایک قانونی جواز ہے، اور اس اعتبار سے ظلم کی انتہائی کریہہ صورت اور خود قرآن کے ولٹن شاؤنگ (Weltanschauung) کے بالکل خلاف ہے[12]۔ ان کے انکار کی دوسری وجہ لفظ سربراہ کے ساتھ جڑے ہوئے وہ تلخ تجربات ہیں جن کی بہت سی مثالیں گرد و پیش میں ہر وقت دیکھ لی جا

---

[11] یہ بھی یاد رہے کہ اس ادارے کو قائم کرنے کی تحریک کسی فکری عمل کا نتیجہ نہیں کہ اس پر دو رائیں ہو سکیں، بلکہ یہ فطرت انسانی کا بدیہی تقاضا اور انسانی تاریخ کا مجمع علیہ عمل ہے کہ اس کے بغیر بچوں کو نہ بڑوں کی شفقت مل سکتی اور نہ بڑوں بوڑھوں کو اپنی نگہداشت کے لیے اولاد کی توجہ ہی میسر آ سکتی ہے۔

[12] اس اصطلاح سے مراد کلی نوعیت کے تصورات ہیں۔ زیر بحث مسئلہ میں اس سے مراد قرآن میں بیان کردہ وہ تعلیمات ہیں جو اپنی نوعیت میں عمومی انداز رکھتی ہیں، جیسے انسانی عظمت یا عدل وانصاف۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.org

سکتی ہیں۔ یہ حضرات شوہر کی سربراہی کو بھی انھی کے تناظر میں دیکھتے اور نتیجتاً اس پر بھی صریح ظلم کا اطلاق کرنے لگتے ہیں۔

پہلی بات کے جواب میں واضح ہو کہ اول تو یہ مسئلہ عورت اور مرد کی جنس کا نہیں، بلکہ شوہر اور بیوی کے رشتے کا ہے[۱۳]، اس لیے اس کی بنیاد پر مرد وزن کی مساوات پر گفتگو کرنا، بالکل بے معنی اور بے محل ہے۔ مزید یہ کہ شوہر کو بیوی پر حاصل یہ سربراہی کسی قسم کی ترجیح یا فضیلت کی کوئی شے نہیں، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر طے کیا گیا عمل کا ایک تفاوت ہے۔ اس اعتبار سے یہ حد درجہ معقول بھی ہے اور از حد ضروری بھی اور محض ایک ذمہ داری ہے اور کچھ بھی نہیں۔ آج بھی ریاست میں یا پھر کسی کاروباری ادارے میں تقسیم کار کے اسی اصول کے مطابق مختلف لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں۔ ایک ریاست کا سربراہ قرار پاتا ہے تو دوسرا اُسی ریاست کا ایک عام شہری۔ ایک شخص کاروباری معاملات میں صاحب کی جگہ سنبھالتا ہے تو دوسرا محنت اور مزدوری کی ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔ یہ سبھی اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے اور اس طرح اپنے اداروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، مگر عمل کا یہ تفاوت ان کی بنیادی حیثیت میں کوئی کمی کرتا ہے اور نہ کسی قسم کا کوئی اضافہ کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح خاندان کے ادارے کا معاملہ ہے۔ اس میں بھی چند ذمہ داریوں کا تعین مرد اور عورت کی بنیادی صلاحیتوں کے لحاظ سے کر دیا گیا ہے۔ یہ تعین ان کے درجوں میں انتظامی قسم کا ایک فرق تو ضرور پیدا کر دیتا ہے، مگر ان کی بنیادی حیثیت میں کوئی کمی یا بیشی ہرگز نہیں کرتا۔ چنانچہ مرد کی سربراہی کو ایک وجۂ ترجیح اور فضیلت کی کوئی چیز سمجھنا اور اسے عدل وانصاف کے خلاف قرار دے لینا، یہ دونوں باتیں صحیح ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر کیے جانے والے اعتراضات ہی صحیح ہیں۔

دوسری بات کے جواب میں عرض ہے کہ سربراہ کا جو تصور ہمارے معاشرے میں رائج ہے وہ فی الواقع قابل رشک نہیں اور لازم ہے کہ اس سے ذہنوں میں اشکال پیدا ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان سربراہوں میں اور شوہر کے سربراہ ہونے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ان میں سے ایک سربراہ وہ ہے جو ظلم اور جبر کا نتیجہ یا کسی بگڑے ہوئے عقیدے کا لازمہ ہوتا ہے، چنانچہ وہ ہر زیردست کو اپنی ملکیت قرار دیتا، اس کے جان ومال کا استحصال کرتا اور ہر دم اس کے درپے آزار رہتا ہے۔ یا پھر وہ سربراہ ہے جو ایک بے حس معاشی نظام کی کوکھ سے جنم لیتا ہے، چنانچہ اپنا ہی مفاد سامنے رکھتا اور اپنے ماتحتوں کے خون کا ہر ہر قطرہ چوس لینے کو ہمہ وقت بے قرار رہتا ہے۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں ایک سربراہ وہ ہے جو کسی غیر کا نہیں، اپنے گھر اور خاندان، اپنی بیوی اور اپنے ہی بچوں کی ماں کا سربراہ

۱۳؎ وگرنہ ایک عورت ہونے کے باوجود، ماں باپ سے تین درجے زیادہ مقام رکھتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ہوتا ہے۔اور صرف سربراہ ہی نہیں، اُس کا ’زَوج‘ اور صاحب ہوتا، اس کے نفع و نقصان میں شریک، اس کے دکھ سکھ کا ساتھی، اس کی جلوت اور ہر خلوت کا ہم نشین بھی ہوتا ہے۔غرض یہ کہ یہ بہت بڑا فرق ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ان دونوں قسم کے سربراہوں میں ذرہ بھر بھی کوئی نسبت مانی جا سکتی اور نہ ایک کو دوسرے پر قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کے ظلم اور مادہ پرستی کا ہوا دکھا کر دوسرے کو جی بھر کر مطعون کیا جائے یا پھر ایک کی رعونت اور خود غرضی کا اشتہار دے کر دوسرے کی محبت اور خلوص کو بھی یک سر رد کر دیا جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com